طیارے کا اغوا ــــــ لمحۂ فکریہ

نعیم صدیقی صاحب

پاکستانی طیارے کے اغوا کا خوفناک ڈرامہ ایک جواں سال اور ذی حیثیت شہری کی جان لے کر بالآخر ختم ہوا۔ ستو؍ سے زیادہ نجات یافتہ " یرغمالیوں کو مبارک باد " اور صدر ضیاء الحق اور ان کے معاونین اور منیروں نے مل کر جو بھاری سفارتی معرکہ لڑا اُس پر " اَحسنتُم "

بہر حال پاکستان کو اس کے تین فضائی قزاقوں نے ہائی جیکنگ کی تاریخ کا طویل ترین باب بنا دیا ہے۔

ہمارے مطالعہ و تفکر کے مطابق جو کچھ ہوا، اچانک نہیں ہوا کہ نہ اس کے پیچھے کچھ عوامل ہوں، اور نہ آگے کچھ مراحل۔ یہ تو ایک طویل زنجیر کا ایک بڑا حلقہ ہے۔ جس کے ساتھ پیچھے کی تمام کڑیاں بھی آگے جڑتی ہیں اور آگے کی کڑیاں بھی مربوط ہیں۔ اب چھپا کیا رہا ہے کہ واشگاف بات کہنے میں کسی کو کوئی تامل ہو۔ یا اس کی اشاعت میں کسی کو احتیاط محسوس ہو۔ پاکستان پیپلز پارٹی، کابل، شام اور لیبیا (جو بظاہر اس واقعہ سے کنارہ کر گیا ہے[1]) ایک ایسا سرخ دائرہ بناتے ہیں جس کا مرکز و محور روس ہے،

---

[1] مگر یہ امر کچھ زیادہ مخفی نہیں رہا کہ لیبیا میں پیپلز پارٹی کے بھگوڑے لیڈروں اور کارکنوں کا ٹھکانا ہے۔ وہاں سے اس گروہ کے لوگوں کو مالی امداد ملتی ہے۔ نیز چھاپہ ماروں کی تربیت کا انتظام بھی موجود ہے مگر اغوا شدہ طیارے کے کابل جانے، وہاں قزاقوں سے سرکاری مہمانوں کا سلوک ہونے، انہیں اسلحہ جہاز میں فراہم کئے جانے، مرتضیٰ بھٹو کے موقع پہ بہ حیثیت سرغنہ نمودار ہونے اور روس اور کابل کے لئے قزاقِ اعلیٰ کے تعریفی بیانات سامنے آنے کی وجہ سے لیبیا نے عین آخر وقت پہ " تقویٰ " اختیار کر لیا حالانکہ دنیا بھر کے قزاقوں کے لئے لیبیا رضاکارانہ اسپرٹ سے باقاعدہ اعلان کر کے پناہ گاہ بنا ہوا تھا۔

ہمیں یہ کہنے میں کوئی چیز حائل نہیں محسوس ہوتی کہ فضائی قزاقی کا متذکرہ ہولناک حادثہ نہ صرف یہ کہ روسی نفوذ کی ایک علامت ہے۔ بلکہ اس سے مقصود پاکستان میں روسی نفوذ کو توسیع و استحکام دینا بھی ہے۔

کون سیاست آشنا فرد اتنا بے خبر ہوگا جسے یہ معلوم نہ ہو کہ ہمارے ہاں بیرونی روپیہ، اسلحہ اور لٹریچر تقسیم ہوتا رہا ہے اور کچھ عرصے سے یہ "بارانِ رحمت" بہت بڑھ گئی ہے۔ خاص طور پر افغانستان میں کھلے کھلے کمیونسٹ راج کے قائم ہونے اور اس کے خلاف افغانی عوام کے جہاد برپا کرنے اور پاکستان میں قافلہ در قافلہ لاکھوں مہاجرین کے آمد کے ساتھ عنایاتِ خفیہ بہت بے پایاں ہوگئی ہیں روسی سفارتخانے میں دانشوروں اور نوجوان طلبہ اور تنظیم کار لیڈروں کی ضیافتوں اور خصوصی ملاقاتوں اور پس پردہ گفتگوؤں کا سلسلہ زوروں پر رہا ہے۔ پیپلز فیڈریشن اور نیشنل فیڈریشن کے طلبہ نے اُدھر ہی کی سرپرستی اور امداد سے انتخابی معرکے لڑے، متعدد بار ہنگامہ آرائی کی اور محب اسلام و پاکستان طلبہ میں سے ایک سے زیادہ کو قتل کیا۔ اور بیسیوں کو جگہ جگہ مارا پیٹا اور ایسے اکثر واقعات بائیں بازو کے طلبہ کے ساتھ غیر طالبعلم غنڈہ عناصر مجرمانہ کارروائیوں میں شامل ہوتے رہے۔ صحافیوں اور اساتذہ اور وکلا میں بھی حامیانِ روس کے حلقے پیدا ہو کر نشوونما پانے لگے۔ روس سے شائع شدہ مخالفِ اسلام و معاندِ پاکستان لٹریچر مختلف مصنفین اور ناشروں کے ناموں سے یہاں پھیلتا رہا، نیز یہاں کے پریسوں سے پرنٹ لائن کے بغیر کئی پمفلٹ اور ہینڈبل چھاپ کر یا سائیکلواسٹائل مشینوں پر تیار کر کے پھیلائے جاتے رہے۔

ادھر کراچی کے پاس روسی امداد سے قائم شدہ سٹیل مل کے ذریعے الگ سے کام کیا جاتا رہا اور آج بھی ہو رہا ہے۔ اس کا بین ثبوت تو یوں سامنے آگیا ہے کہ فضائی قزاقوں میں سے ایک یعنی ارشد علی، اسٹیل مل میں رہ چکا ہے۔ نمائندہ نوائے وقت کے الفاظ میں "اسٹیل ملز کے ذرائع نے آج یہاں بتایا کہ ارشد علی خاں کا اس ٹولے سے گہرا تعلق تھا جو اسٹیل ملز میں خلاف قانون سرگرمیوں میں ملوث رہا۔ ارشد علی اور اس کے ساتھیوں کے خلاف دفعہ ۳۰۷ کے تحت مقدمات درج کئے گئے" مگر دوسری طرف یہ ہوا کہ "سٹیل ملز کے بعض افسروں کی طرف سے ملزموں کی مبینہ پشت پناہی کی گئی۔"

واضح رہے کہ اخباری اطلاع کے مطابق یہ لوگ اسٹیل ملز میں آتشزنی کا ارتکاب کر کے کئی شعبوں کو نقصان پہنچا چکے ہیں۔

اس سے پہلے اخبارات میں مجمل طور پہ یہ حقائق آچکے ہیں کہ فولادی کارخانہ چلانے کے لئے جن نوجوان انجینئروں اور دیگر کارخانوں کو خصوصی تربیت کے لئے روس لے جایا جاتا رہا ہے۔ ان کو وہاں الحاد سکھانے، اشتراکیت پہ ایمان لانے اور اشتراکی انقلاب برپا کرنے اور اس غرض کے لئے وطن میں تخریبی کارروائیاں کرنے کی تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ نوجوان عنصر کو جس کا اسلامی شعور اور کردار بھی پختہ نہ ہو، اگر کسی ملحدانہ و مادہ پرستانہ جبری معاشرے کے ماحول میں دنیا اور وطن سے الگ تھلگ رکھا جائے اور مال اور جنس اور شراب کا دباؤ اس پہ بڑھا دیا جائے تو اس کی دماغی تطہیر (BRAIN WASHING) کس درجے کی ہو گی۔ ملحدانہ اشتراکی تعلیم کے علاوہ اسے پڑھنے کے لئے جو اخبارات، دیکھنے کے لئے جو مناظر اور تصویریں اور ٹیلی ویژن اور سننے کے لئے جو ریڈیو مقدر ہوں گے ان سب کی قوت اسے ایک ہی معین سمت میں دھکیلے گی۔ وہاں کوئی اسلامی لٹریچر نہیں، ادارے نہیں، آباد مساجد نہیں، اپنے طرز کی دینی اور قومی تقریبیں نہیں، ملاقات کے لئے شخصیتیں نہیں۔ مخالف اسلام دعووں کے جواب میں دلائل دینے والا کوئی نہیں۔ مجلسیں اور ملاقاتیں بھی تمام اشتراکی فضا رکھنے والی، اور گفتگوئیں بھی سراسر اشتراکی خطوط پہ! پھر روس میں جا کر تعلیم و تربیت پانے والوں کو نہ صرف یہ خیال کہ اپنے اساتذہ اور ممتحنوں کو مطمئن کر کے پاس ہونا ہے بلکہ بعد میں بھی اسٹیل ملز کے روسی افسروں ہی کے فیضانِ نظر سے قرب اور ترقی کے مواقع سے فائدہ اٹھانا ہے۔ اِدھر خود اسٹیل ملز پہ روسی امداد سایہ افگن ہے اور روسی افسران اس چھوٹی سی اقتصادی و صنعتی ریاست کی قیادت اور چودھراہٹ پر قابض ہیں۔ یہاں بھی سلسلۂ تربیت قائم ہے اور دماغی تطہیر کا عمل جاری ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہماری حکومت کا نظامِ نگرانی وہاں کس حد تک کام کرتا ہے اور ہماری انتظامی مشینری رفتارِ احوال پر کتنا قابو رکھتی ہے۔ بہرحال یہ امر بالکل واضح ہے کہ اب ہماری سیاسی تاریخ جیسی کچھ بھی بنے گی اس میں اسٹیل ملز کا مؤثر دخل رہے گا۔

پچھلے دنوں ہلٹن ہوٹل میں فیض احمد فیض کی جو سترویں سالگرہ منائی گئی تھی ایسے ہمارے ہاں بالعموم

ایک عام سی مجلس سمجھا گیا ہے ۔ حالانکہ یہ ایک علامتی اقدام تھا۔ اس پردے میں روس کو بھی اور پاکستان کے اندر بکھرے ہوئے کمیونسٹ اور نیم کمیونسٹ عناصر کو بھی سرخ جھنڈی ہلا کر اشارہ دے دیا گیا تھا کہ ہمارا کارروان جادہ پیما ہو رہا ہے اور لائن کلیئر ہے ۔ اس کارروان کا پیش آہنگ پیپلز پارٹی ہے ۔ کمیونسٹوں کے سامنے عرصہ سے یہ گائیڈ لائن ہے کہ وہ جہاں کمزور ہوں خود اگلی صف بنا کر کوئی معرکہ آرائی نہ کریں ، بلکہ ہر ملک کی کسی ایسی مقامی پارٹی کو کاربرآری کے لئے چن لیں جو نظریاتی لحاظ سے ان کے کسی قدر قریب ہو حتیٰ کہ اگر محض کوئی سیکولرسٹ جتھا ایسا مل جائے جو تخریب کاری اور جبر و تشدد کے طریقوں سے کام لے کر ماحول کو تعمیری مقاصد کے لئے تباہ کر سکتا ہو تو اس کے لئے زندہ باد کہہ دیا جائے ۔ ہمارے ہاں کے کمیونسٹوں کا نصیبہ جاگا تو پیپلز پارٹی وجود میں آئی ۔ اول تو پارٹی کا نام کمیونسٹوں کی علامتی اصطلاح اپنے اندر رکھتا تھا۔ پھر جب پارٹی کا تثلیثی کلمہ وجود میں آیا تو اس کا ایک جزو یہ تھا کہ "سوشلزم ہماری معیشت" ہے ۔ اس کی تشریح میں "روٹی، کپڑا ، مکان" کا نعرہ نمودار ہوا۔ یوں گویا کمیونسٹوں کے لئے امید کا ایک بڑا دروازہ کھل گیا ۔ پھر پارٹی نے اپنے دورِ عروج میں فسطائیت کی راہ اختیار کی ، غنڈوں کی سرپرستی کی ، مزدوروں اور کسانوں اور چھوٹے ملازموں کو نظام معاشرہ کے خلاف متحرک کر دیا۔ طرح طرح کے تصادم پیدا کئے ۔ مخالفین کو قتل کرایا۔ اور سینکڑوں کو عقوبت خانوں کے حوالے کیا۔ جس سے جو چاہا چھین لیا —— وہ عہدہ ہو یا زمین یا عمارت یا کارخانہ —— اور جسے جو چاہا دے دیا۔ جس قانون کے خلاف جو فیصلہ پسند آیا نافذ کر دیا۔ پیپلز پارٹی کے اس سیاسی کردار نے تو ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ جیسے پانچوں انگلیاں گھی میں ہوں ۔ اور سر کڑاہی میں۔ اپنے لوگوں کو جا بجا انہوں نے اندر داخل کر دیا۔ اور نمایاں قسم کے انتہا پسند انقلابی باہر بیٹھ کر "سگنلنگ" کرتے رہے (یعنی اشارے دیتے رہے) ۔ اندر اور باہر کے کمیونسٹ اسٹیج اور اخبارات اور مجلّوں اور ریڈیو اور ٹیلی وژن کے ذریعے پیپلز پارٹی کے سیکولر مادہ پرستانہ ، سوشلزمی اور فسطائی کردار کا تحفظ کرنے اور دوسری جانب کی مخالف جماعتوں کے خلاف محاذ آرائی میں لگے رہے ۔ حتیٰ کہ شعر و ادب جیسے لطیف پیرایوں میں بھی انہوں نے زہر چکانی کی ۔ ان کی سردجنگ ۱۹۷۷ء کے بعد نہ صرف مارشل لا حکومت کے خلاف جاری رہی ، بلکہ محب وطن جماعتوں کے خلاف اور خود اسلام کے خلاف

انہوں نے لمحہ بہ لمحہ وار کیے ہیں۔
نوبت بایں جا رسید کہ کمیونسٹوں کی فرنٹ لائن کی حیثیت سے کالعدم پیپلز پارٹی جس کی قیادت بیگم نصرت بھٹو اور متعلقہ خاندان میں مرتکز ہے، ہائی جیکنگ جیسی غدارانہ کارروائی کی محرک بنی۔

اس وقت روس اور کارمل حکومت کو درد سر یہ درپیش ہے کہ پاکستان کے خواص و عوام جن میں موجودہ حکومت کی ساخت یا اس کے بعض اقدامات اور طریق کار سے اختلاف رکھنے والے عناصر بھی موجود ہیں، وہ آخر ایسی کارروائیاں کرتے کیوں نہیں کہ ایک طرف تو خود حکومت پاکستان کی توجہ مسئلہ افغانستان اور مہاجرین افغانستان سے ہٹ کر اپنے اندرونی احوال پر مرتکز ہو جائے، اور دوسری طرف دنیا کے لیے بھی پاکستان ایک نیا موضوع فراہم کر کے اقوام عالم کی توجہات کو افغانستان سے ہٹائے اور روس کے خلاف بہنے والا عالمی پروپیگنڈے کا دھارا کچھ کمزور پڑے۔
پہلے دن سے پاکستان نے افغانستان پر مصنوعی کمیونسٹ حکومتوں کے ٹھونسے جانے کے خلاف اپنا موقف لیا ہے۔ لیکن کارمل کے دور کے ساتھ ساتھ قریباً ایک لاکھ روسی فوج کے افغانستان میں بل پڑنے کے خلاف جب سے اقوام متحدہ، اسلامی کانفرنس اور تیسرا بلاک کہلانے والے غیر جانبدار ممالک کے اسٹیج سے زوردار آواز بلند ہوئی ہے، روس کا پیچ و تاب بڑھ گیا ہے اور ببرک کارمل کی حکومت بھی بہت جھنجھلائی ہوئی ہے۔
اس زمانے میں ادھر سے سارا زور اس پر صرف کیا جا رہا ہے کہ کسی طرح پاکستان میں کوئی بڑا ہنگامہ کھڑا کیا جا سکے۔ ورنہ روس کی عالمی حیثیت کو جتنا شدید نقصان پہنچ رہا ہے، وہ اس کے لیے اضطراب انگیز ہے۔ تخریب اور شورش انگیزی کا کھیل رچانے کے لیے روسی ہدایت کاروں کو اب تک بیوہ نصرت بھٹو سے زیادہ بہتر کوئی ہیروئن ملا، نہ ہیروئن۔ چنانچہ بیگم صاحبہ نے متعدد موقعوں پر قانون اور حکومت کے خلاف متحرک ہو کر کوئی طوفان اٹھانا چاہا، مگر فلیتہ تو بار بار جلا، بارود بھک سے نہیں اڑ سکا۔
لیکن تیاری ساتھ کے ساتھ جاری رہی اور نقشہ ایک بین الاقوامی تحریک کا اختیار کیا گیا۔ ایک

اڈا لندن بنا، دوسرا لیبیا، تیسرا کابل اور چوتھا رنوڈیرو، جو مرکز تھا۔ باہر کے مرکزوں نے ایک تو پروپیگنڈا کی قوت کو استعمال کیا، مالی مصارف کا انتظام کیا۔ کارکنوں کو چھاپہ مار ٹریننگ دلوائی۔ اور روس سے منصوبہ بندی میں رہنمائی لی۔ دوسری طرف اندرونِ ملک مختلف قسم کے کام کیے گئے۔ بلوچستان میں کسی قدر کم، اور سندھ میں زیادہ زور دیا گیا پیپلز پارٹی اور بھٹو ازم کے حق میں اور موجودہ حکومت اور اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کے انتظامات کیے گئے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ سندھ کے اندرونی حصوں میں کیا ہو رہا ہے اور کیا کیا چیزیں چھپ کر تقسیم ہو رہی ہیں۔ ادب کو کس رنگ میں رنگا جا رہا ہے اور طلبہ کے ذہن کیسے بنائے جا رہے ہیں۔ اور جرائم پیشہ غنڈوں کو کس طرح استعمال کیا جا رہا ہے۔ اور کوئی نہیں جانتا کہ اب تک اس طوفان کی لہروں کا مقابلہ کرنے کے لیے محض "حبسِ دم" کا طریقہ کیوں اپنایا گیا ہے۔

دوسرا بڑا کام "پیپلی" بہادروں نے یہ کیا کہ ملک میں بموں کے دھماکوں سے لے کر بینک لوٹنے تک کی بہت سی ایسی تخریبی کارروائیاں کیں، جن سے ایک طرف قوم کو بہت مالی نقصان پہنچا — دوسری طرف لوگوں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوا اور تیسری طرف تخریب کاروں نے تجربہ کی منازل طے کر لیں۔

خاص طور پر پچھلے دنوں بنک ڈکیتیوں کی جو کارروائیاں پے در پے ہوئیں اور جن میں طریقِ واردات کی یکسانی کام کرتی ہے اور یکسانی یہ بھی ہے کہ مجرم بھاگنے میں کامیاب ہوئے اور پکڑے نہیں جا سکے۔ اُن کے بارے میں آسانی سے یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ سب کچھ کسی منصوبے کے تحت ہوتا رہا ہے — اِس سے مزید تخریبی کاموں کے لیے مجرمین نے سرمایہ بھی حاصل کیا۔

تیسرا محاذ جو شروع ہونے سے پہلے ہی درہم برہم ہو گیا۔ سات پارٹیوں (جو پہلے نو تھیں) کے اس نام نہاد اتحاد کی شکل میں سامنے آیا، جسے عرفاً ایم آر ڈی کہا جاتا ہے[1]۔ اس نام نہاد کے دھندلے سے ڈھانچے کا نقیب "پی پی" بنا۔ ماہرانہ سروں نے اس غبارے میں زور زور سے پھونکوں سے ہوا

---

[1] ایک لطیفہ ایم، آر، ڈی کو اگر اردو حروف میں بدلا جائے تو وہ ہوں گے "م ر د"۔ حامی تو ان حروف سے لفظ بنائیں گے: مَرد۔ مگر واقعاتی لحاظ سے اب یہ کہنا صحیح ہوگا: "مُرد"۔

بھرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی - مگر یہ پوری طرح پھولنے سے پہلے ہی پھٹ گیا - اوّل تو اس اتحاد میں پارٹیاں کم تھیں اور "ہیرو" زیادہ - پھر شروع ہی میں دو کی علیحدگی ہو گئی - بقیہ کے بارے میں یہ چرچا تھا کہ دستخط کرنے والے دادا اور لیڈر مغالطے میں رہے ہیں - اور وہ شاید چل نہ سکیں گے - اب تو خیر ساری تعمیر میں مضمر خرابی ایک ڈائنا مائیٹ بن گئی ہے اور ملبہ بکھر رہا ہے -

بیگم صاحبہ نے اس کھیل کا آغاز کرتے ہوئے جو باتیں کہی تھیں اگر اُن کے ساتھ بیٹھنے والے لوگ سمجھدار ہوتے تو اسی وقت اُن کے تیور پہچان لیتے - وہ ایک طرف تو سیاسی انتقام کا نعرہ بلند کر کے ایک منفی تخریبی سیاست کا راگ الاپ رہی تھیں - دوسری طرف مخالفین کو دھمکیاں دینے کے علاوہ موجودہ حکومت کو اس طرح چیلنج کر رہی تھیں جیسے اُن کے ہاتھوں میں بھرا ہوا پستول ہے اور وہ پورے پاکستان اور اُس کے اقتدار کو ایک طیارے کی طرح اغوا کر کے لے جائیں گی - اُن کی اسکیم یہ تھی کہ اِدھر ایم - آر - ڈی سڑکوں پر نکل کر توڑ پھوڑ شروع کرے گی - ہر طرف ہڑتالوں کا دور دورہ ہو گا - ہر طبقے اور شعبے کے لوگ چاروں طرف سے حکومت کے خلاف اُمڈ پڑیں گے تو کسی شدید طوفانی لمحے میں یکایک پی - آئی - اے کے طیارے کا اغوا مُلک کے سربراہوں کو بوکھلا دے گا - تب وہ موقع پیدا ہو گا کہ وہ کبر و نخوت کے گھوڑے پر سوار ہو کر قبضۂ اقتدار کی طرف بڑھیں گی - اور سات پارٹیاں اُن کی رکاب تھامے ہوئے ہوں گی - واقعی لاجواب خواب تھا - مگر خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا ، جو سُنا افسانہ تھا -

آپ سوال کر سکتے ہیں کہ یہ شبہ کرنے کے کیا وجوہ ہیں کہ بیگم صاحبہ اور اُن کی کالعدم پیپلز پارٹی کا کوئی تعلق طیارے کے اغوا سے تھا - بات یہ ہے کہ یہ اغوا جس طرح واقع ہوا ہے ، جن لوگوں نے یہ جرم کیا ہے ، پھر کابل میں جو صورتِ حال پیش آئی ہے ، سامنے جن مجرموں کو رہا کرانے کی فہرست قزاقوں نے پیش کی ہے - الذوالفقار نامی خفیہ تنظیم کے جو کارنامے فخریہ انداز سے قزاق لیڈر نے پیش کیے ہیں - اور پھر جس طرح مرتضیٰ بھٹو صاحب متذکرہ تنظیم کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے "موقع" پر اپنے کارندوں کے کمال کا ملاحظہ کرنے پہنچے ہیں - یہ ساری چیزیں واقعات کی کڑیاں بیگم صاحبہ کے دماغ سے جوڑ دیتی ہیں - اگر بات یوں نہیں تو بیگم صاحبہ یہی فرمائیں کہ انہوں نے مرتضیٰ بھٹو سے علیحدگی و بیزاری کا کوئی اعلان پہلے کبھی کیا ؟ کبھی اُس کے چھاپہ مار منصوبوں کے لیے اپنی ناپسندیدگی کا اعلان کیا ؟ چلیے یہ بھی نہ سہی - واقعہ ہو جانے پر جو بیان انہوں نے دیا ، کیا اس میں کوئی ایسی چیز موجود ہے جو اُن کو قزاقی

کے واقعہ سے الگ کر دے۔ اس بیان کا انداز دوسرا ہے۔ اس میں تو یہ کہا گیا تھا کہ اس واقعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ملک کے حالات کتنے خراب ہیں۔ اور صدر ضیا الحق کو بڑی تحدی سے کہا گیا تھا کہ وہ نوشتۂ دیوار پڑھیں۔ کیا اس بیان میں انہوں نے قزاقوں کے فعل کے خلاف نفرین کی؟ کیا انہوں نے ملک و قوم کے لیے ہمدردی کا کوئی کلمہ کہا؟ کیا انہوں نے مصیبت میں مبتلا ہونے والے یرغمالیوں کی حالت پر اظہارِ رحم فرمایا؟

آج سارا کھیل بگڑ جانے کے بعد اگر بیگم صاحبہ حادثے سے اپنی اور کالعدم پیپلز پارٹی کی بے تعلقی کا دعویٰ کرتی ہیں تو وہ بے معنی ہے۔

فضائی قزاقی کے اس حادثے نے جو سوال کھڑے کر دیے ہیں، ان میں سے ایک بڑا سوال یہ ہے کہ کالعدم پیپلز پارٹی اور اس کے اکابر و کارندوں کو اتنے بڑے جرم کا موقع کیوں ملا؟

یہ موقع اس لیے ملا کہ ایک غلط کار قوت کو، جس نے ملک تڑوایا، جس نے ہر دفتر اور کارخانے اور ادارے کو کام لینے والوں اور کام کرنے والوں کا اکھاڑہ بنا دیا، جس نے اختلاف کرنے والوں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا، جس نے جرائم پیشہ طبقوں کے لوگوں کو سیاسی محاذ پر لا کھڑا کیا، جس نے اپنے مخالفین کو عہدوں اور ملازمتوں سے ہٹا کر اپنے آدمیوں کو ان کی جگہ بٹھایا، جس نے تھانوں اور دفتروں پر پارٹی ورکروں کو اجارہ داری دلوائی، جس نے سرکاری خزانے اور بنکوں کے سرمایے سے اپنے لوگوں کو روپیہ دلوایا اور راشن ڈپو اور سیمنٹ کی ایجنسیاں بخشیں، جس نے اخلاقی قدروں کو تہ و بالا کر دیا۔ جس نے انتخابات کے دوران میں جمہوریت کو تہس نہس کر دیا۔ اس کا زور توڑنے کے لیے آخر ضروری اور جائز حد تک بھی تدابیر کیوں نہیں کی گئیں۔

ضروری تھا کہ قرطاس ابیض میں شائع شدہ بدعنوانیوں کی تحقیق کی جاتی اور مغصوبہ اموال و املاک کو ضبط کیا جاتا اور سزائیں دی جاتیں۔ ضلع وار کمیشن بٹھا کر نئی شکایات کی تحقیق کی جاتی۔ جن لوگوں کو پارٹی کے دورِ اقتدار میں اہم جگہوں پر بٹھایا گیا تھا، ان کی نشاندہی ہوتی، خصوصاً نظامِ تعلیم اور ذرائع ابلاغ کی تطہیر اولیت رکھتی تھی۔ پارٹی کے لیڈروں اور معروف

کارکنوں پر پابندی لگائی جاتی کہ وہ سیاسیات اور انتخاب میں ایک عرصے تک شرکت نہیں کرسکتے۔ نئی بھرتی پر پابندی لگا دی جاتی ۔ راشن ڈپوؤں ، پٹرول پمپوں اور سیمنٹ ایجنسیوں اور دوسرے نیم سرکاری ادارہ ہائے مفاد سے اُن کو الگ کیا جاتا۔ طیارے کے اغوا کے بعد اب یہ بھی ضروری ہوگیا ہے کہ تمام متعلقہ اداروں اور افراد کی چھان بین کی جائے اور ہائی جیکروں کو واپس لایا جائے۔

غالباً حکومت اس وجہ سے چشم پوشی کرتی رہی کہ پیپلز پارٹی کی بڑی قوت ہے، اور اگر اُسے چھیڑا گیا تو مشکل ہوگی ۔حالانکہ بڑی قوت ہونے کا تصور بھی ایک فریب نظر ہے ۔ پارٹی عین انتہائی عروج پر تھی تب بھی انتخاب میں اس کی کامیابی تہائی ووٹوں سے کم پر ہوئی تھی ۔ جولائی ۱۹۷۷ء کے فوراً بعد انتخابات ہوتے تو یہ پیمانہ اور بھی گر جاتا۔ ویسے بھی پچھلے چند سال میں اس پارٹی کے اثرات دھیمے پڑ گئے ہیں ۔ آئندہ اگر جداگانہ انتخابات متناسب نمائندگی کے مطابق ہوں اور پیپلز پارٹی رجسٹریشن کراکے شامل بھی ہوجائے، تو دس پندرہ فی صد سے زیادہ تعداد ووٹوں کی اُسے نہ ملے گی ۔ خواہ مخواہ کی مرعوبیت کا بوجھ لادے رکھنے سے کام اور خراب ہوا ہے۔

اب بھی حکومت کو غور کرنا چاہیے کہ طیارے کے اغوا کا حادثہ منفرد واقعہ نہیں ، بلکہ اس کے بعد کچھ اور چیزیں بھی پیش آسکتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ باہر کی جمع شدہ قوت اپنی آزاد حکومت قائم کرکے پیپلز لبریشن آرمی منظم کرے، اس کے چھاپہ مار دستے روسی اور کارملی سپاہیوں سے مل کر افغانستانی سرحد سے حملے کریں ۔ ادھر اندرونِ ملک کچھ وقفے کے بعد پھر ہنگامہ آرائی کرائی جانے لگے ۔

پس اب بھی وقت ہے کہ حکومت پاکستان کے تحفظ اور معاشرے کے امن کو بچانے کے لیے نہایت مضبوط اور مؤثر تدابیر اختیار کرے۔

سلسلۂ گفتگو میں سردار عبدالقیوم صاحب کا بیان بھی ایک موضوع بن گیا ہے۔

پہلے تو اس پر مبارک باد کہ سردار صاحب کو ہوش آگئی اور انہوں نے سمجھ لیا کہ پیپلز پارٹی کے ساتھ مل کر چلا نہیں جا سکتا۔ مگر سوال یہ بھی تو ہے کہ جس دن آپ ایم آر ڈی میں شامل ہوئے تھے، کیا اس دن اس پارٹی کے سابق جرائم اور اس کا تشدد پسندانہ کردار سامنے نہیں تھا؟ برسوں ایک جماعت نے آپ کے سامنے اپنے نظریات بیان کیے، اپنے اسلوب کار کا مظاہرہ کیا۔ خود آپ کو دلائی کیمپ میں رکھ کر اپنے سیاسی فلسفے کا عملی روپ دکھایا۔ پھر مرتضٰے بھٹو، شاہنواز بھٹو، کھر، جسٹس صفدر کی نقل و حرکت ہی نہیں، ان کے بیان اور انٹرویو آپ کی نظر سے گزرے، بیگم صاحبہ اور بے بی صاحبہ کی ادھوری حرکتیں آپ نے بار بار ملاحظہ فرمائیں اور ابھی ماضی قریب میں پیپلز پارٹی کے سرغیلوں نے کرمل حکومت کو تسلیم کرنے کے ارادے ظاہر کر کے قوم پر یہ واضح کر دیا تھا کہ وہ روسی ٹینکوں کا استقبال کرنے کے لیے گلدستے اور ہار لیے کھڑے ہیں۔ اس سارے دور میں اگر آپ کو پارٹی کی مخصوص جبلت کا اندازہ نہیں ہو سکا تو آپ اپنی سیاسی بصیرت کے متعلق خود ہی رائے قائم کیجیے۔ جو شخص دوسروں کا لیڈر بن کے اٹھا ہو، اگر ملک کے افراد اور گروہوں کو سمجھنے میں وہ یہی کمال دکھائے کہ طیارہ اغوا ہونے کے بعد اُسے یکایک معلوم ہو کہ اس میں تو پیپلز پارٹی کا ہاتھ ہے۔ اور یہ پارٹی تشدد پسند ہے، تو پھر پیروؤں کا کیا بنے گا؟ ایک آپ ہی نہیں، بڑے یا چھوٹے سات آٹھ گروہوں کے لیڈر صاحبان آپ کے ساتھ شریک تھے۔ ان میں سے کسی کی بصیرت بھی پیش پا افتادہ حقیقت کو نہ پا سکی۔ کیا ان صلاحیتوں کے ساتھ ملک کی سیاسی قسمت سے کھیلنا اچھی بات ہے؟ کیا لیڈروں کا ذہنی معیار ایسا ہی ہونا چاہیے؟

اب اگر سارا بھانڈا پھوٹ گیا ہے تو پھر ایم۔ آر۔ ڈی کے کچے ہیولے سے علیحدگی کا فیصلہ کرنے میں اتنا اہتمام کیوں کہ سارے شرکا سے مل کر فیصلہ کیا جائے۔ وہ ایک فاسد تنظیم کا ڈھانچہ تھا، جو ابھی تک مکمل طور پر تشکیل یافتہ بھی نہیں ہے۔ آپ پر اگر یہ راز کھل گیا ہے کہ اصل چیز پیپلز پارٹی تھی اور وہ اس محاذ کو استعمال کرنا چاہتی تھی۔ اور یہ کہ اب یہ نام (ایم۔ آر۔ ڈی) بدنام ہو گیا ہے، تو پھر کیوں نہ یک قلم آپ نے اپنے آپ کو اس سے الگ کر لیا۔ بقیہ لوگوں سے بعد ازاں بھی بات چیت ہو سکتی تھی۔ (تازہ ترین اطلاع کے مطابق سردار صاحب نے ارادہ بدل لیا ہے۔)

مجھے بڑا افسوس ہوا کہ سردار عبدالقیوم اور نواب زادہ نصراللہ خاں جیسے حضرات جنھوں نے برسوں میں اپنا ایک مقام بنایا تھا، آناً فاناً اُسے (ایم - آر - ڈی) کی بھینٹ چڑھا آئے — افسوس ہے اُس نقصان پر جو انھوں نے اپنے آپ کو پہنچایا اور جس کی وجہ سے آئندہ بھی جن حلقوں میں بیٹھیں گے اُن کی قدر و قیمت بھی گرے گی۔

غیر مشہور مثل کے مطابق صبح کے بھولے اگر شام کو ٹھکانے پر واپس آجائیں تو اُن کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔ پس محبانِ وطن سردار صاحب کی واپسی پر خوش آمدید کہتے ہیں۔

کالعدم پیپلز پارٹی یا بیگم نصرت صاحبہ کیا تھیں اور کیا ہیں، اس سے قطع نظر ہمارے وارفتگانِ جمہوریت کو ایک اور بات بھی سوچنی چاہیے تھی وہ یہ کہ آیا آج حالات ایسے ہیں کہ اُن میں پُرہنگامہ تحریکیں کھڑی کی جائیں۔

افغانستان میں روس پرست حکومت کے قیام اور روسی فوج کے داخلے کے بعد پاکستان مشکل ترین حالات سے دوچار رہے۔ ایک طرح کی سرد جنگ جاری ہے اور جاسوسی اریشہ دوانی اور سازش کاری کے چکر چل رہے ہیں۔ جنوب مشرق سے بھی مسلسل تار ہل رہے ہیں۔ اِس ملک کو توڑنے کے لیے ایک بار پھر بالائی سطح پر سرگوشیاں ہیں۔ کمیونسٹ اور سیکولرسٹ عنصر پہلے ہی چھاپہ ماری کے تجربے کر رہا ہے اور سیاسی قتل کے متعدد واقعات میں ملوث ہے۔ افغانستان کے دس پندرہ لاکھ بھائیوں کی موجودگی ہمارے لیے بڑی ذمہ داریاں لے کے آئی ہے۔ اور اس بھاری مسئلے پر مسلسل بھرپور توجہ صرف کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے کہ افغان مجاہدین کی معرکہ آرائی ہمارے لیے ذریعہ تحفظ ہے تو پھر ہم پر یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ ہم افغانستان کے زخمیوں، معذوروں اور مجبورانہ حالات میں ملک چھوڑنے والوں کے لیے انصار بنیں۔ اور اپنے ہاں کوئی ایسا طوفان نہ اُٹھائیں کہ خود ملک کی توجہات بھی مجاہدین و مہاجرین سے ہٹ جائیں اور ساتھ ہی دُنیا کی نگاہیں بھی اُدھر سے ہٹ کر ہماری طرف لگ جائیں۔

سردار عبدالقیوم اور دوسرے لیڈروں کو یہ تو سوچنا چاہیے تھا کہ ہر راگنی اپنے وقت ہی پر اچھی لگتی ہے۔ کیا ہی بُرا وقت چھانٹا آپ لوگوں نے ملک میں گرم تحریک اُٹھانے کے لیے اور کس موقع پر آپ نے دھمکیوں کی زبان استعمال کی۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ ایم - آر - ڈی کے وجود کا اعلان ہوتے ہی

اور اس کی طرف سے تحریک اٹھانے کا ارادہ ظاہر ہوتے ہی مختلف دائروں سے مطالبے لے کر متعدد طبقے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے ہڑتالوں اور مظاہروں اور حکومت سے کشمکش کا آغاز کر دیا۔ ڈاکٹروں اور وکیلوں اور طلبہ نے ہنگامہ خیز سیاست کی سڑک پر مارچ شروع کر دیا۔ اگر خدانخواستہ یہ سلسلہ جاری رہتا تو پاکستان سیدھا روس کے سایے کے نیچے ببرک کارمل کی گود میں ہوتا۔ اور آپ بتائیے کہ پھر آپ کو جمہوریت کہاں سے ملتی اور جمہوریت کا استعمال آپ کیا کرتے۔ جمہوریت کی ضرورت ہمیں تب ہے کہ پاکستان کا وجود اور اس کی آزادی محفوظ ہو۔ اگر خدانخواستہ یہ وجود اپنی آزاد صورت میں برقرار نہ رہے تو پھر جمہوریت کوئی کوکاکولا کی بوتل تو نہیں کہ جو حالات بھی ہوں اس کا ڈھکن کھول کر آپ چسکیاں لیتے رہیں۔

زندگی کی تمام سرگرمیوں میں کچھ ترجیحات (PRIORITIES) ہوتی ہیں۔ اسی طرح سیاست میں وقت وقت کی ترجیحات ہوتی ہیں کہ پہلے کیا اور پھر کیا؟ اس وقت کا ترجیحی مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان کی کشتی اس گرداب سے صحیح سلامت نکل جائے، جو حالات کے بگولوں سے بن گیا ہے۔ یہ ہو چکے تو اندر کے جھگڑے طے کیے جاتے رہیں گے۔ ترجیحات کو ملحوظ رکھ کر موزوں وقت کا انتظار کرنا اور جلد بازی سے بچنا صبر اور ایثارِ جذبات کا راستہ ہے۔ اور یہ سیاست کی اہم ترین ضروریات ہیں۔

آپ کو دیکھنا یہ بھی چاہیے تھا کہ قوم کی مجموعی عوامی فضا کسی معاملے میں ساتھ دینے کے لیے تیار ہے یا نہیں؟ افسوس کہ اس کا اندازہ بھی آپ نہ کر سکے۔ بلاشبہ سوچنے سمجھنے والے لوگ جمہوری فضا کے طلب گار ہیں۔ یقیناً معاشی مسائل کی وجہ سے غریب طبقے مضطرب ہیں۔ سچ ہے کہ ہر طرف خیانت اور بدعنوانی کا جو دور دورہ ہے اس نے جمہور کو احساسِ تحفظ سے محروم کر رکھا ہے۔ لاریب جرائم کا چڑھتا ہوا طوفان اور بے حیائی کا ریلا لوگوں کا سکھ چین چھین رہا ہے۔ درست کہ حکومت کی پالیسیوں کا تضاد اور جھول، نیز اسلام کی راہ میں ہونے والی ادھوری کارروائیاں، ذمہ داروں کے فیصلوں کے خلاف تدبیریں، عملے کا ٹیڑھا رویہ، یہ ساری چیزیں حالات سے بیزاری پیدا کرتی ہیں، مگر دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ پاکستان کی محبِ وطن اکثریت، خصوصاً اس کے دینی عناصر کسی بھی طرح اس پر راضی نہیں ہیں کہ کوئی چیز ملک کے لیے خطرہ بنے، یا ہنگامہ آرائی کا طوفان قومی املاک اور دفتری کارکردگی اور کاروباری سرگرمی اور تعلیمی اداروں کے لیے ضرر رساں ہو۔ چنانچہ ایم آر ڈی

کے ظہور پر تھوڑی بہت جو گرما گرمی پیدا ہوئی، عوام نے اسے اچھی نگاہوں سے نہیں دیکھا، خصوصاً طیارے کے اغوا نے تو اُن کی آنکھیں کھول دی ہیں۔

وہ گھٹیا سیاست باز ہوتے ہیں جو حکومت و قیادت سے ناراض ہو کر سارا انتقام ملک و قوم سے لیتے ہیں۔ سوال یہ نہیں کہ صدر ضیا الحق ضرور رہیں اور اُن کا نقشۂ کار حرف بہ حرف صحیح ہے، بلکہ آنجناب سے مجھے بھی اختلافات ہیں، فوجی حکومت کا سلسلہ دراز ہوتے جانے سے مجھے بھی اضطراب ہے، اُن کے اقدامات اور پالیسیوں پر مجھے بھی اطمینان نہیں ہے۔ میں بھی موجودہ نقشۂ احوال میں تبدیلی چاہتا ہوں، مگر مجھے کیسی طرح گوارا نہیں ہے کہ موجودہ صدر اور نظام کے خلاف طوفانی ٹکراؤ کا آغاز کر کے میں ایک طرف ملک کے اندر کے تخریبی عناصر کے ہاتھ مضبوط کر دوں اور دوسری طرف روس اور ببرک کارمل اور بھارت کے لیے اپنے قومی گھر کے پھاٹک کھول دوں۔

جسے سیاسی کام کرنا ہو، اور خاص طور پر قیادت کرنی ہو اس کے کچھ اُصول ہونے چاہییں۔ کیسے عناصر کے ساتھ میل جول ممکن ہے اور کن کے ساتھ نہیں؟ کیسے مواقع پر حکومت سے آویزش نہیں کرنی چاہیے۔ کیا کیا طور طریقے اور کیا کیا اندازِ گفتگو اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ساری باتیں طے کر کے میدان میں آنا چاہیے اور آنے کے بعد برسوں تک اپنے کردار سے مظاہرہ کرنا چاہیے کہ لیڈر اپنے اصولوں کے وفادار ہیں۔ سیاسی کردار کا سکہ ایک دفعہ کھوٹا ہو جائے تو پھر کبھی از سرِ نو اس کا کھرا پن نہیں منوایا جا سکتا۔

اب ایک تلخ تجربے نے جو سبق دیا ہے اس کے تحت محبِ دین و وطن سیاسی جماعتوں اور اُن کے لیڈروں کو طے کر لینا چاہیے، اور اس پالیسی کو (DECLARE) کر دینا چاہیے کہ اوّلاً ہم جب کبھی متحد ہوں گے اور جب بھی کوئی محاذ بنائیں گے تو ایک تو ہمیشہ جانی پہچانی محبِ دین و وطن جماعتوں کے ساتھ مل کر بنائیں گے۔ دوسرے کسی ایسے مرحلے پر کوئی گرم تحریک نہیں اُٹھائیں گے جس کا بالواسطہ اثر ملک کی آزادی، سالمیت، استحکام اور عزّ و وقار کے خلاف پڑتا ہو۔ تیسرے سیاسی تحریک کے لیے ایسے طور طریقے اختیار نہیں کریں گے جن سے تخریبی عناصر کو اُبھرنے اور قومی املاک کو تباہ کرنے اور ملک کے بے گناہ باشندوں کو اذیت دینے کا موقع ملے۔

خاص طور پہ دینی جماعتوں اور اداروں اور اشخاص کے لئے تو شدید طور پر لازم ہو گیا ہے کہ وہ

سیاسی اور فقہی اور فرقہ وارانہ جھگڑوں کے دفتر لپیٹ کر وقت کے دریا میں بہا دیں اور اختلافات رکھنے کے باوجود شانوں سے شانے ملا کر الحاد اور لادینیت اور سیکولرازم اور سوشلزم کے علانیہ اور خفیہ حملوں کے خلاف فکری و سیاسی جہاد کا محاذ آراستہ کریں۔ اگر احیائے اسلام کے مقصدِ جلیل کے بجائے اپنی اپنی گروہی یا ذاتی برتری کی غلط جد وجہد جاری رہی، اگر آپس کے ہر اختلاف پر کشاکش ہوتی رہی اگر ایک دوسرے کے خلاف اسٹیجوں اور لاؤڈ سپیکروں اور پریس کے ذریعے "فساد فی سبیل اللہ" جاری رہا تو گویا آپ نے اس بڑی لڑائی میں ملّت کی ویسی ہی شکست کا سامان کر دیا جیسی شکست سمرقند و بخارا میں پیش آئی تھی۔

محبِ دین و وطن جماعتوں کی قوت جہاں مخالفینِ اسلام و پاکستان کی مساعی کے خلاف متحرک ہو وہاں وہ یہ کوشش بھی ضرور کرے کہ فوجی نظامِ حکومت، سول نظامِ حکومت میں بدلے اور یہاں ایک جواب دہ قیادت برسرِ اقتدار آئے، نیز نفاذِ اسلام کے اقدامات ادھورے، متفرق اور متضاد نہ ہوں، اور نہ ایسی انتظامیہ آن کو غلط مفہوم دے کر اور ان کی عملی شکل بگاڑ کر ستیاناس کر سکے جس میں ہر سطح پر مخالفینِ اسلام، مخالفینِ پاکستان، فدائیانِ مغرب، پرستارانِ اشتراکیت، وفادارانِ روس اور خدمت گارانِ نفس بیٹھے ہوئے ہیں۔ مطلوب یہ ہونا چاہیے کہ ایک متعین منصوبے اور تفصیلی نقشۂ کار کے تحت احسن ترتیب سے اقدامات ہوں۔ اور ان اقدامات میں جہاں کہیں سے خلل اندازی ہو، اقتدار کی نگاہ بھی فوراً وہاں پہنچے اور اُس کا آہنی پنجہ بھی۔

نوٹ: یہاں سے آگے مستقبل کے لیے حکومت کے سامنے کچھ مشورے رکھے گئے تھے، لیکن عبوری آئین کے نفاذ نے پوری صورتِ حالات بدل دی ہے اور اس پر از سرِ نو تفصیلی غور کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ لہٰذا باقی باتیں پھر کبھی!